فضل احمد کریم فضلی کے ناول ''خونِ جگر ہونے تک''میں علاقائی ثقافت اور زبان کے اثرات

[1]محمد طارق انصاری

Abstract:

The influence of regional language and culture is significant in Fazali's Novel, Khon-e-Jigar Hony Tak being the greatest genre of Urdu language has a greater capacity of linguistic content and cultent commentary than other genres of Urdu language. There, we can maintain that Pakistani Urdu novel has the impact of regional languages and culture. Due to its cultural and civilizational aspects, Urdu language has an ability of expansion. The living and progressive languages have the capacity to absorb new words. This process of comprehension and acquisition synchronize the language with the new times. Therefore, the adoption of modern, terms of science and arts helps expansion. Evolution has been innate in Urdu since its inception with the espousal of words of regional languages, people of different areas can come closer. As human beings, divided into different tribes and families, are in contact with each other; likewise, the languages, being apart, have deep concern amongst them.

Keywords: **Fazal Ahmad Karim Fazali, Urdu Novel, Pakistan, Bangol, Linguistic, Diction, Dialect, Culture, Lingual Influences.**

کلیدی الفاظ: فضل احمد کریم فضلی، اردو ناول، پاکستان، بنگلا دیش، لسانیات، اسلوب، لہجہ، ثقافت، لسانی اثرات

اصناف ادب میں ناول ایک ایسی صنف ہے جس کے فرضی قصے میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے جس علاقے کا قصہ بیان ہوتا ہے اس علاقے کی ثقافت کے سارے رنگ جھلکتے ہیں اور پورا سماج جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے فضل احمد کریم فضلی کا ناول ''خون جگر ہونے تک'' بنگال کے ایک گاؤں کی کہانی ہے جس نے اس گاؤں، اور ارد گرد کے پورے علاقے کی ثقافت اور زبان کو اپنے اندر سمولیا ہے۔ اس ناول کی جڑت اپنے لوکیل

---

[1] استاد، شعبہ اردو، پنجاب کالج، بہاول پور

(Local) سے اتنی زیادہ ہے کہ جس نے زندگی میں کبھی بنگال نہیں دیکھا وہ بھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے اس نے ناول پڑھنے تک کا عرصہ مشرقی بنگال کے گاؤں ''گھوڑامارا'' میں گزارا ہے۔

بنگال جغرافیائی طور پر مغربی پاکستان سے بالکل مختلف سرزمین ہے۔ چھالیہ، ناریل، کھجور، کیلے اور پپیتے کے بلند درخت اور بانس کے گھنے جھنڈ ہیں۔ پانی کی فراوانی، پانیوں میں تیرتی کچری پانا (نرگس یا نیلوفر آبی) کی بیلیں سبز پتوں اور فالسائی رنگ کے پھولوں کا حسین امتزاج ہیں۔ دھان کے خوشبودار کھیت جیسے دھانی سمندر موجیں مار رہا ہو۔

مشرقی بنگال کا یہ گاؤں ''گھوڑامارا'' کئی ٹیلوں پر مشتمل ہے ہر گھر ٹیلے پر بنا ہوا ہے۔ اکثر گھر سو سو دو دو سو گز کے فاصلے پر ہیں برسات میں ہر ٹیلہ جزیرہ بن جاتا ہے، آنے جانے کے لیے کشتی استعمال ہوتی ہے۔ خوشحال گھروں میں قریبی جگہوں پر جانے کے لیے ڈونگی استعمال ہوتی ہے اور اسے بانس کی مدد سے کھینچتے ہیں (ڈونگی، تاڑ کے تنے میں خول کر کے بنائی گئی چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں)

ذرائع آمد و رفت کے لیے بجرے، کشتیاں اور لانچیں استعمال ہوتی ہیں امراء اور سرکاری استعمال میں جو لانچیں ہیں ان میں تمام آسائش اور سہولت موجود ہے کئی کمرے، غسل خانے، باورچی خانہ، بجلی کے بلب اور فرنیچر موجود ہے، لانچ کا عملہ اور نوکر چاکر۔

زیادہ تر گھر بانس کی مدد سے بنائے گئے ہیں ٹین (Tin) کی دیواریں اور چھتیں خوشحالی کی علامت ہیں ۔گھروں کے دروازے پر ٹاٹ اور بانس کی جالیاں پردے کے طور پر لٹکائی جاتی ہیں۔ خوشحال گھروں میں امرود اور لیچی کے پیڑ بھی لگائے جاتے ہیں۔ گھر کے قریب بنے تالاب میں ہر سال مچھلی کے بچے ڈالے جاتے ہیں۔ یہ مچھلی گھر کی ضرورت بھی پوری کرتی ہے اور بیچی بھی جاتی ہے۔ ان تالابوں سے نہانے اور پینے کھانے کے لیے پانی بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ رفع حاجت کے لیے پودوں کی آڑ میں چلے جاتے ہیں۔

یہاں کی منفرد بات یہ ہے کہ بانسوں کے چھیر پر پوال اور پٹ سن کے ڈنڈلوں کا انبار لگا کر اس پر راکھ، کوڑا، دھول اور مٹی ڈال کر کھیت بنالیا جاتا ہے اور زیادہ تر اس پر سبزی کاشت کی جاتی ہے۔ سطح آب پر تیرتے ہوئے یہ کھیت گویا تازہ سبزی کی دکانیں ہیں۔

''ٹیلے کے نیچے ایک ہرا بھرا کھیت تیر رہا ہے، بڑے بڑے کہنڈے اور کھیرے لدے ہوئے ہیں۔''(۱)

یہ متحرک کھیت گھر اور بیچنے کے لیے سبزیاں مہیا کرتے ہیں۔ یہ کھیت شام کو گھر کے قریب بانسوں کی مدد سے باندھ دیے جاتے ہیں۔

''وہ کھیت کے جزیرے کو کھے کے کئی بازاروں میں بھی لے گیا تھا۔''(۲)

یہ کھیت سیلاب اور طوفان میں بہہ بھی جاتے ہیں اور چوری بھی ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ چاول پٹ سن اور فصل کی ترکاریوں پر ان کی معشیت کا دار و مدار ہے۔ بید اور جیگل کی لکڑی سے فرنیچر بنانا۔ بید کی ٹوکریاں، کھجور کی چٹائیاں بنانا، کپڑا بننا اور دھان کوٹنا بھی ذریعہ معاش ہے۔ دودھ کے لیے گائے اور بکری پالی جاتی ہے۔ عورتیں ساڑھی باندھتی ہیں اور مرد لنگی (تہمد) اور قمیض یا بنیان استعمال کرتے ہیں ۔ کھانے میں زیادہ تر مچھلی کا سالن، چاول اور دال پکتے ہیں خاص موقعوں پر پلاؤ، رس گلے اور بانس کی ٹوکری میں جمایا گیا دہی بھی کھایا جاتا ہے۔

بڑے ٹیلے پر ہر صبح چھوٹا سا بازار سج جاتا ہے۔ جہاں سے مچھلی، ترکاری، دودھ اور دہی مل جاتا ہے۔ گاؤں میں ایک دو دکانیں بھی ہیں۔ جن پر دال، چاول، موم بتی، لالیٹن کی چمنی، سگریٹ، دیا سلائی، مٹی کا تیل، نمک، مرچ اور گھی دستیاب ہے۔

گاؤں میں سلہٹ، نواکھلی، کلکتہ اور چٹاگانگ شہروں کے تذکرے ہوتے رہتے ہیں کالی گنج، حاجی گنج، چتر بھدر شن، شہزاد پور اور لوہاگاڑا تک تو اس گاؤں کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس گاؤں کے لوگوں کی اجتماعی سرگرمیوں میں کبڈی کے میچ، محفل میلاد اور سالانہ کشتیوں کی دوڑ قابل ذکر ہے۔ کشتیوں کی دوڑ

سرکاری سطح پر ہوتی ہے۔ کشتی دوڑ، میں سجی ہوئی کشتیاں رنگ برنگے بادبانوں کی بہار دکھاتی ہیں۔ دریا کے کنارے پر عارضی بازار سج جاتا ہے لوگ والہانہ انداز میں شرکت کرتے ہیں ایک میلے کا سماں ہوتا ہے۔

''سرخ، نیلے، پیلے بادبانوں، جھنڈیوں اور جھنڈوں کی بدولت ساری فضا قوس وقزح بنی ہوتی تھی۔''(۳)

سیاسی جلسوں میں گاؤں کی سجاوٹ کرنا، گانا، مزاحیہ نقلیں کرنا، جادو کے کھیل دکھانا اور اس کے علاوہ لوگوں کا آپس میں مل بیٹھنا اجتماعی ثقافتی سرگرمیوں میں شامل ہے۔

مسلم اکثریتی بنگال کے مسلمانوں کی طرح اس گاؤں کے مسلمان بھی مذہبی حوالے سے جذباتی ہیں مذہب سے محبت کرتے ہیں۔ مولوی صاحب کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔ بچوں کے نام مولوی صاحب تجویز کرتے ہیں اور یہ نام عربی زبان سے ماخود ہوتے ہیں (حالاں کہ بنگال کے لوگ عربی صوتیات کو ادا کرنے سے قاصر ہیں) مثلاً مخلص الرحمن، جلیل الدین، نورالانوار، نورالابصار اور ابوالبرکات، تاج الاسلام، محمد ذوالقرنین، شان خدا وغیرہ۔

عربی، فارسی اور اردو سے شغف باعث فضیلت سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کے اوراق سے بیماروں کو ہوا دی جاتی ہے۔ مرتے ہوئے شخص کے سرہانے سورۃ یٰسین پڑھی جاتی ہے۔ میت کو بیری والے پتوں ملے پانی سے نہلانا اور میت والے گھر کھانا بھیجنے کا بھی رواج ہے۔ کفن دفن اور جنازے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ بزرگوں اور پیروں سے تعویز لینا اور نذرانے دینے کا بھی رواج ہے۔ کوئی فوت ہو جائے تو اس کو ٹیلے پر بنے گھر میں ہی دفن کیا جاتا ہے۔ عورتیں پردے کی پابندی کرتی ہیں اور مردوں سے میل جول پسند نہیں کیا جاتا۔ ہندوستان کی ثقافت میں عورت کی اپنے خاوند سے وفا کی روایت عقیدے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ناول کے قصے میں چاند شیخ کی بیوہ ہاجرہ خاوند کی وفات کے بعد خاوند کی چادر ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہے اور جب وہ مری تو وہی چادر اس پر ڈال کر دفن کر دیا جاتا ہے۔

''وہ اپنی مٹھی میں اب بھی چاند شیخ کی تہمد پکڑے ہوئے تھی۔ اس کی مردہ انگلیوں نے
مشکل سے تہمد چھوڑی جمعدار صاحب نے وہی تہمد اسے اُڑھادی۔ اور اس پر ایک مٹی کی
چادر بھی چڑھادی۔''(۴)

اس گاؤں میں ہندو بھی رہتے ہیں۔ لیکن مذہبی حوالے سے امن کی فضا قائم ہے۔ ہندو معاشی طور پر خوش حال اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ویسے دونوں مذاہب کے لوگ ایک ہی ثقافتی رنگ کے حامل ہیں صرف مذہب کا فرق ہے۔ اس خطے کی بنیادی شناخت ہندو کلچر ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی نسبت بنگال میں اسلام زیادہ پھیلا ہے لیکن بیرونی علاقوں کے مسلمان کم پہنچے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا بنیادی کلچر تبدیل نہیں ہوا۔ اور ان کی نسل بھی خالص رہی ہے۔ عربی صوتیات کا مسئلہ بھی اسی لیے موجود ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کی زبان نے یہاں کی مقامی زبانوں کو زیادہ متاثر نہیں کیا۔ جب کہ زبان کے حوالے سے پنجاب کے سکھوں کو بھی عربی صوتیات ادا کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔

۱۹۳۹ء کے مشرقی بنگال کا یہ گاؤں اجتماعی طرز حیات کی ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور اس گاؤں کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی تنگ دستی ہے۔ انگریزی تسلط اور غلامی کے باوجود مغرب اور سائنس کے ثمرات ابھی یہاں نہیں پہنچے۔ وبا کے دنوں میں ملیریا سے بچاؤ کے لیے کونین، پوڈی کلون اور مپاکرین بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ ریڈیو نے سب کو متوجہ کیا ہے۔ اور اس ایجاد سے بنگال کے اس گاؤں کے لوگ مستفیض ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء کے حوالے سے دیکھا جائے تو ''گھوڑا مارا'' گاؤں کے لوگوں کا سیاسی شعور بہت بہتر ہے اور ان کی عالمی سیاست پر بھی نظر ہے۔ تعلیم کی اہمیت سے بھی واقف ہیں۔ اور اس گاؤں میں دینی اور دنیاوی علم کی بحث موجود ہے۔ ویسے بھی ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کے مراکز ڈھاکا اور کلکتہ رہے ہیں۔ جدید تعلیم اور پرنٹنگ پریس کے حوالے سے بھی یہ علاقے سبقت رکھتے ہیں۔ لیکن ثقافتی طور پر اپنی قدیم ثقافت سے منسلک رہے ہیں۔ مذہب سے محبت کی وجہ سے انھوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اور ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نام سے نیا ملک وجود میں آیا۔

سٹینلی میرن کی تالیف '' پاکستان معاشرہ اور ثقافت ''(Pakistan Society and Culture)کی تمہید میں لکھا گیا ہے کہ :

> '' پاکستان دنیا میں واحد ملک ہے جس کے دو علیحدہ علیحدہ حصے ہیں اور ان میں کوئی ایک ہزار میل کا غیر ملکی علاقہ حائل ہے۔''(۵)

ویسے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیوں کہ ماضی میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں جغرافیائی طور پر مرکز سے دور علاقوں کو انتظامی طور پر یکجا رکھا گیا ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعد برطانوی حکومت نے اپنی Coloniesکو جوڑے رکھا۔ مسلمانوں نے خلفاء راشدین کے زمانے اور بعد میں دور دراز علاقوں پر حکومت کی ہے۔ حالاں کہ مفتوحہ علاقوں کو یکجا رکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔بنگال مسلم اکثریتی علاقے کا نظریے کی بنیاد پر مغربی پاکستان کے ساتھ اشتراک ہوا تھا۔ تحریک پاکستان میں سیاسی، اقتصادی اور مذہبی بندھن کی وجہ سے دوری کے باوجود مقصد ایک ہو گیا تھا۔ فاصلے کی بات کریں تو امریکہ کی ریاست ہوائی امریکہ کے مغربی ساحل سے دو ہزار چار سو میل دور ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے حوالے سے مغربی پاکستان کا رویہ ناپسندیدہ تھا۔ دلوں میں کینہ اور نفرت پنہاں تھی۔ مسائل حل کرنے کی بجائے بعض ناپسندیدہ باتوں کو ہوا دی گئی۔

گنجان آبادی کے باوجود مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۱ء میں صرف چار شہری مرکز تھے۔جب کہ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں کم گنجان ہونے کے باوجود کراچی کے علاوہ چودہ شہری مرکز تھے۔ مشرقی پاکستان میں ایک چوتھائی ہندو آبادی ہے لیکن مشرقی پاکستان کا تقریباً ہر شخص بنگالی ہے۔ ثقافتی اور لسانی تفریق نہیں ہے۔ایشیا کے دو سب سے بڑے دریا برہم پتر ااور گنگا مشرقی پاکستان میں بہتے ہیں دونوں کے ملاپ سے دریائے پدما بنتا ہے۔آسام کی پہاڑیوں سے آنے والا دریائے ہرما، مشرقی پاکستان میں میگھنا کے نام سے دریا کرنافلی بھی یہاں کا مشہور دریا ہے۔ان بڑے دریاؤں کے ساتھ بہت سے معاون دریا اور نہریں ہیں جن کی وجہ سے اکثر سیلاب آتے رہتے ہیں۔ مون سون سے بھی چار ماہ تک سیلابی کیفیت رہتی ہے۔اس کے برعکس مغربی پاکستان کی تقریباً ساری آبادی مسلمان ہے۔ جغرافیائی خدوخال بھی مختلف ہیں۔ لیکن بہت زیادہ نسلی گروہوں کا مجموعہ

ہونے کی وجہ سے غیر واضح معاشرتی نظام ہے۔ ثقافتی نسلی، لسانی اور مذہبی وفاداریاں بعض اوقات متصادم ہو جاتی ہیں۔

جمیل جالبی اپنی کتاب ''پاکستانی کلچر''(۱۹۶۴ء) میں لکھتے ہیں کہ :

> ''یہ سمجھنا کہ مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کے اندر اور پھر مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان اتحاد صرف مسلمان ہونے کے سبب خود بخود قائم رہے گا کتنی بڑی غلطی ہے۔ یہ وحدت صرف و محض کلچر کی سطح پر حاصل ہو سکتی ہے۔''(۶)

لیکن ہمارے ارباب اختیار نے یہ نکتہ سمجھنے کی بجائے چنگیزی طریقے استعمال کیے۔ جب کہ اس طرح کے مسائل وسیع النظری، وسعت قلبی اور صبر و تحمل سے حل کرنے چاہیں۔ قومی ثقافت اور قومی زبان کی تشکیل کے لیے علاقائی ثقافت اور زبانوں کو پروان چڑھنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن صد افسوس کہ سقوط ڈھاکا کے بعد بھی سبق حاصل نہیں کر پائے۔

زبان کسی بھی ثقافت کے اظہار کا سب سے اہم ذریعہ اور علامت ہوتی ہے۔ ثقافتی وحدت کے لیے لسانی وحدت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھارت بھی ایک کثیر لسانی اور ثقافتی ملک ہے۔ انھوں نے ۲۲ زبانوں کو سرکاری زبانوں کا درجہ دیا ہوا ہے۔ روس ماضی قریب میں کثیر لسانی ملک تھا۔ وہاں کسی زبان کو بزور ختم کرنے کی کوشش نہیں گئی۔ قومی سطح پر خود بخود روسی زبان نے رابطے کی زبان کا کام کیا۔ اسی طرح سوئزر لینڈ میں جرمن، فرانسیسی اور مقامی زبان بولی جاتی تھی۔ جرمن زبان مشترک وسیلہ اظہار کا درجہ حاصل کر گئی اور باقی دونوں زبانیں اپنے علاقوں تک محدود رہیں۔ اگر مشرقی پاکستان کی زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا جاتا تو کوئی قباحت نہ تھی۔ مغربی پاکستان میں اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان و ثقافت اور مشرقی پاکستان میں اردو زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی جاتی تو کچھ عرصے بعد خود بخود دوریاں ختم ہو جاتیں۔ ثقافت اور زبان کا فروغ صرف شعراء، ادیب اور اہل فن ہی کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اگر فضل احمد کریم فضلی کے ناول ''خون جگر ہونے تک'' کی زبان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنگال میں بھی اردو کے ذخیرہ الفاظ میں، بنگالی روزمرہ، محاورہ اور الفاظ شامل ہو رہے تھے۔

ناول کے بیانیے میں ۱۹۵۸ء میں (بھلے وہ مصنف کا ذاتی بیانیہ ہو) اس بات کا اظہار کیا جارہا ہے کہ بنگال کے لوگ ''فوج'' کے بارے میں اچھا خیال نہیں رکھتے۔ لیکن ہم نے سارے مسائل اسی ایک ادارے سے حل کرانے کی ٹھان رکھی ہے۔

۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان سے جدا ہو جانے والا گنجان آبادی اور غربت وافلاس زدہ ''بنگلہ دیش'' کئی سال تک پاکستان جیسے مسائل کا شکار رہا ہے لیکن ۲۰۲۰ء کا بنگلہ دیش ترقی کی شاہراہ پر پہنچ چکا ہے۔

عام طور پر قدیم روایت کو چھوڑ کر نیا اسلوب اختیار کرنے کے حوالے سے قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین اور شوکت صدیقی (جانگلوس) کی مثالیں دی جاتی ہیں لیکن ۱۹۵۷ء میں شائع ہونے والے ناول ''خون جگر ہونے تک''، میں فضل احمد کریم فضلی نے علاقائی ثقافت اور علاقائی زبان کو خوبصورتی کے ساتھ اپنے بیانیے کا حصہ بنایا ہے۔ اور یہ اردو زبان کے لیے ایک خوش آئند اور مفید بات تھی۔ اور اس اسلوب کے ذریعے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لسانی اور ثقافتی بُعد کو کم کیا جا سکتا تھا۔ رضا علی عابدی کے مطابق اردو کسی زبان کا نام نہیں یہ کوئی بھاشا نہیں۔ یہ بول چال، رکھ رکھاؤ اور زندگی بسر کرنے کے ایک قرینے کا نام ہے۔ اردو اصل میں لشکر کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو اس میں فرد نہیں آتا یہ ایک اجتماع کے رویے کا نام ہے۔

فضل کریم فضلی نے اردو کے اس اجتماع اور لشکر میں بنگالی کو شامل کر دیا تھا۔ اردو کے جلوس میں ہندوستان کے دیگر علاقوں کے لہراتے جھنڈوں میں بنگالی زبان کا نمائندہ رنگ بھی شامل کر دیا تھا۔ بنگال کے اس لسانی رنگ کو قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول کے آخر میں ناول کے بارے میں بات کرتے ہوئے مصنف نے زبان اور اسلوب کے بارے میں کہا ہے۔

''جہاں تک مکالموں کا تعلق ہے جو اردو میں ہوئے وہ مقامی روز مرہ میں لکھے گئے ہیں اور
جو بنگلہ میں ہوئے انھیں عموماً صحیح اردو میں لکھا گیا ہے۔ البتہ جس طبقہ کا کوئی کردار ہے
اسی طبقے کی مناسبت سے اردو روز مرہ استعمال کیا گیا ہے۔''(۷)

اس ناول میں مصنف نے لسان (زبان) کا جو تجربہ کیا ہے۔ اس میں ہمیں چار قسم کی زبان کا عکس ملتا ہے۔

۱۔ بنگالی تلفظ

۲۔ ہندی کے اثرات

۳۔ مقامی روز مرہ کے اثرات

۴۔ مصنف کا اصل اسلوب

ناول ''خون جگر ہونے تک'' میں استعمال ہونے والی زبان کا ایک پہلو یہ ہے کہ بنگال کے لوگ عربی صوتیات کو ادا نہیں کر سکتے اس لیے جب وہ بولتے ہیں تو الفاظ کا تلفظ بگڑ کر ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے مثلاً:

اصل الفاظ	بنگالی تلفظ	صفحہ نمبر
جلیل الدین	ذلیل الدی	۱
جمعدار صاحب	زمان دار شاب	۲
وکٹوریا کراس	بھگٹوریا کراس	۱۵
مجید صاحب	موزید شاب	۳۱
زندہ باد	جندہ باد	۳۶
سلطان میاں	چھلتان میاں	۵۰
مستنصر باللہ	موچھن بلا	۵۳
مخلص الرحمن	مکلیشور رمن	۵۵

ضرور	جرور	۵۰
لانچ	نانچ	۵۰
جمعہ	زمہ	۳۳۵
قمیص محمد	کمیج محمد	۶
شانو	چھانو	۶

زبان معاشرت کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ ہے۔ قدیم ہندو معاشرت کی وجہ سے بنگالی معاشرے پر ہندومت کے واضح اثرات ہیں۔ اس لیے ہمیں مشرقی بنگال کے اس گاؤں ''گھوڑامارا'' کی کہانی کے بیانیے ہندومت کے اثرات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور یہ مصنف کی فن کارانہ چابکدستی کا ثبوت ہے:

جملے میں استعمال	صفحہ نمبر
او جلودھر بابو!	۱۰
دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا	۱۶
ہم رزائن دھرم کے کارن دیا	۱۶
ترک ہمارا دھرم کا بھائی ہے	۱۶
لوگ پرنام کرتے	۶۸
کوئی رشی منی تھوڑی ہیں	۶۹
ہے بھگوان لڑائی اس طرح جاری رکھو	۷۲
بھوجن کرنے بیٹھے ہی تھے	۸۵
شریمتی جی نے اپنے شریمان جی کو پریشان نظروں سے دیکھا	۸۵
ایک دم سے رسوئی کے باہر دوڑ پڑے	۸۵
پرجا جیتیں تو پرجا کی حالت سدھرے	۱۴۱

پر رنام کرنا ان کی شایان شان نہ تھا	۱۴۶
جب تک کلجگ لگا ہوا	۱۴۶
جب ست جگ آئے گا	۱۴۶
بابو جی کی آشیر باد سے اچھا ہے	۱۴۷
جمعدار صاحب نے اسے کوئی سراپ نہ دی ہو	۲۱۵
سرگباشی پتاجی کہا کرتے تھے کہ لکشمی جی اس پر دیا کرتی ہیں۔۔	
جس کے دل میں دیا نہیں ہوتی	۲۱۸
آپ کتنے دیالو ہیں	۳۰۷
حضور کا پر جا ہیں	۳۲۵
ہم تو خود سوراج مانگتے چلے آئے ہیں	۳۲۵
بھگوان کی کرپا	۳۵۳
اب چنتا جانے دو	۳۵۴

اس کے علاوہ جگہوں اور کردار کے ہندوانہ نام اور ہندو دھرم سے متعلق باتیں شامل ہیں مثلاً چتر بھدر شن، کالی کی مورتیں، کالی ماں کی لیلا، ہری منڈل، چھوت چھات ذات پات، آریا جاتی، مہاسبھائی اچھوت ابیناش، سواستک، کلدیپ وغیرہ۔

ناول کی زبان پر سب سے زیادہ اثرات علاقائی زبان بنگالی کے ہیں اردو زبان کے بیانیے میں بڑی مہارت کے ساتھ بنگالی زبان کے الفاظ روزمرہ، محاورہ اور ضرب الامثال زبان سمو دیا گیا ہے مثلاً:

جملے/روزمرہ/محاورہ/ ضرب الامثال	صفحہ نمبر
میاں شابو تو بڑھانے رہے ہیں	۸
چاچا بمکے	۱۱

کوئی اندہ نہ بندہ	۱۲
تو بھیا جرمن ترکن سے بھی بڑھ گئے	۱۳
''چوپ''، مگر اس ''چوپ'' کا جلود ھر پر کوئی اثر نہ ہوا	۱۵
لیو نانیا لیمن چوس آیا ہے	۱۶
ایک بڑا جانڈیل سپاہی کھڑا تھا	۲۰
لوگ لاٹھی پاٹھی لیے کسی کھیت کے لیے لڑنے مرنے پر تلے ہیں	۳۱
دونوں ٹیلوں کے درمیان ایک شاکھو تھا	۴۰
بانس کے ٹڑکی ایک دیوار کھینچ دی گئی	۴۹
البت کرے گا جرور کرے گا	۵۰
دھنی لوگ بلیک مارکیٹ کر رہا ہے	۵۰
بھدر لوگ تھوڑی ہے	۵۰
لوگ پانی پھکواٹے اور دعا تعویذ کے لیے آنے لگے	۵۳
ہمارا باپ کا پیر نام دیا کھائی مسلمان نام ہے	۵۴
ہم پیر فقیر البت نہیں مانتا	۵۴
کچھ چھنکے اور فوراً گھوڑا مارا پہنچے	۶۸
میں دکھائیں گے کہ آپ سے اچھا کام کر سکتے ہیں کہ نہیں	۵۵
ایسا بات اپنے گھر میں نہیں سننے سکتے	۵۵
لندن سے بولتے ہیں کبھی کون کون جگہ سے	۶۹
مکان کے نیچے گڈھے میں سڑایا جا رہا تھا	۷۴
سار (سر) معاف مانگتا	۸۳

مار ڈالے حرام زاد کو حرام زاد در حرام زاد	۸۳
جائے دئیں چاچا جائے دئیں	۸۴
آپ سے تو صاحب سے خاطر ہے	۹۶
ایک جوڑ پیتل کا بندا خریدا	۹۶
رنگی چونگی چمچم چمکتی رنگین جھنڈیوں سے سجی ہوئی	۹۶
جلودھر بوا رہا تھا	۱۱۸
حلال کی کمائی کا سوکھا بھات اچھا	۱۳۹
ایسا ہی ہوتا تو میں کیوں بیٹھنے	۱۴۲
آپ اور کوئی بات کہنے سے میں خوشی سے کرنے سکتے تھے	۱۴۳
تمھاری دوا در من کرائے	۱۶۰
بیماری اماری	۱۷۹
قمیص لپ سے نکلا اور نو دو گیارہ ہو گیا	۲۲۲
وہ جلودھر کے دل میں مل گیا ہے	۲۲۴
میں بھی چلیں	۲۳۱
انھوں نے یہ اتہام لگایا	۲۶۰
میرے داماد ہی کو ناتھ دیا	۲۶۴
پانی جھمر جھمر برس رہا ہے	۲۷۷
جھاڑی میں کتے سیار کا ڈر ہے	۲۸۹
یتیم بچے بھر بھر دوڑ کے آ گئے	۳۰۴
نگن بابو در کے در کھڑے تھے	۳۰۹

میں بتانے نہیں سکتے ۳۱۴

نگن بابو ''آگیاں'' کہکے دوڑے ۳۲۴

ناول کی ہیت کو غزل کی طرز پر استوار کیا گیا ہے ہر باب غزل کے ایک شعر کی مانند ہے لیکن یہ غزل، غزل مسلسل ہے۔ ایجاز، اختصار، اشاریت اور ایمائیت سے کام لیا گیا ہے (ناول کی ہیت موضوع نہیں ہے) میر کا اسلوب بھی یہی ہے کہ وہ مقامی الفاظ کو استعمال کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے جب کہ غالب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

ناول کے آخر میں مصنف نے جو ناول کے بارے میں لکھا ہے۔ اس میں کہتے کہ :

''بنگال اور بنگال کے لوگوں سے جو محبت ہے اسکے احترام کے طور پر اس نے ان کی زندگی پیش کرتے وقت اپنے غبار سے حتی الامکان اس کے دامن کو ملوث نہین ہونے دیا۔''(۸)

لیکن لاشعوری طور پر قصہ بیان کرتے ہوئے ناول میں کئی مقامات پر ہمیں مصنف کا اصل اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً صبح کا سہانا وقت تھا اور وہ بھی مشرقی بنگال کی صبح کا، دنیا سبز رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھان کے کھیتوں کا دھانی سمندر موجیں مار رہا تھا۔۔۔۔۔ ناریل اور کھجور کے درختوں کی بدولت فضا میں سیکڑوں ہزاروں مانگیں نکلی ہوئی تھیں۔ جہاں جہاں منظر نگاری کی گئی ہے یا ناول کے کئی ابواب کی ابتدا کے جملوں میں مصنف کا ذاتی اسلوب جھلکتا ہے فضل کریم کا ذاتی اسلوب بھی دل کش ہے لیکن انھوں نے واقعات کرداروں اور علاقائی منظر نامے میں جس طرح مقامیت کے رنگوں کو اجاگر کیا ہے وہ زیادہ خاص بات ہے اور خاص طور پر جس زمانے میں اس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اس زمانے میں تواردو زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ اور روزمرہ کے استعمال کو معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے ذاتی اسلوب کی جھلکیاں باب نمبر ۲ کے شروع میں۔۔۔۔۔ ایک جگہ آفتاب اپنے سیاروں کے جھرمٹ میں جلوہ فرما تھے۔ چوتھا باب۔۔۔ نظام شمس و قمر تو اپنی جگہ ہی پر قائم تھا۔ صفحہ نمبر ۹۸۔۔۔ اماوس کی اندھیری گھپ رات تھی آسمان سے کروڑوں حوریں تاروں سے جھانک رہی تھیں ۔۔۔ کنارے پر لاکھوں جگنو کی پریاں رقص کر رہی تھیں جیسے زمین پر آسمان اتر آیا ہو۔ شبنم میں نہائی ہوئی ٹھنڈی

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی آغوش دریا کو گدگداتی۔۔۔ پانچواں باب۔۔۔ بنگال کی فصابد ستور مجسم شعر و نغمہ بنی ہوئی تھی۔۔۔ ساتواں باب۔۔۔۔ بنگال کی فضااب بھی مسکرا رہی تھی۔۔۔ دریائے پدما مستانہ وار بہہ رہا تھا۔ آٹھواں باب۔۔۔۔ بنگال کی زندگی بالکل غزل بنی جارہی تھی، میر کی غزل۔۔۔۔ سادگی بھی تھی، مٹھاس بھی، لوچ بھی، ترنم بھی مگر اندر اندر ایک ربط پنہاں تھی، ایک گہرا غم بھی، سوز بھی، گداز بھی،۔۔۔ تیرھواں باب اب میر کی غزل کی جگہ حافظ کی غزل لے رہی تھی ساقی مائل بہ کرم تھا۔ شراب و شاہد کا دور دورہ تھا۔ کاگ اڑ رہے تھے۔۔۔ چودھواں باب۔۔۔ بنگال کا جادو شباب پر تھا۔۔۔۔ گھٹاؤں کے بھیس میں پریاں قطار اندر قطار آرہی تھیں رنگ برنگ کی ساریاں پہنے۔۔۔ تقریباً ہر باب کی ابتد میں لفاظی اپنے دور کے رواج کی اور طرز تحریر کی عکاسی کررہی ہے اس سے مصنف کی اردو شاعری خاص طور پر غزل سے محبت اور پسندیدگی کا بھی اظہار ہوتا ہے اور فارسیت بھی جھلکتی ہے۔ مثلاً:

فارسی جملے	صفحہ نمبر
دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ	۱۸۲
مریدان خوش عقیدہ	۲۱۰
حدیت دیگراں	۲۱۰
نشاط روح	۳۲۷
نقرئی تبسم، عشرت کدے	۳۲۷

لسانی تغیر پذیری آغاز سے ہی اردو زبان کی سرشت میں داخل رہی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

> ''اردو زبان کی ساخت میں پورے برصغیر کی قدیم اور جدید بولیوں کا حصہ ہے۔ یہ عربی اور فارسی جیسی دو عظیم زبانوں اور برصغیر کی تمام بولیوں سے مل کر بننے والی لغت اور صوتیات کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی اور قبول عام کے لحاظ سے ممتاز ترین زبان ہے۔''(۹)

مصنف کے اپنے بیان کے مطابق اس ناول میں زبان و بیان کا نیا تجربہ کیا گیا ہے اس طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ محب وطن اہل قلم نے وقت کی اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان کے دونوں حصوں کو قریب لانے کے لیے زبان و ثقافت کا تعارف کروایا جائے لیکن افسوس کہ حادثہ ہو کر رہا۔ خود مصنف نے اس ناول کا انتساب اسی مکتب ادب کے نام کیا ہے:

''اس مکتب ادب کے نام جو مشرقی پاکستان میں زیر تشکیل ہے۔''

مصنف کا کہنا ہے کہ حسن بیان اس وقت ہوتا ہے جب معانی الفاظ میں نئی جان ڈال دیتے ہیں جب معانی اور افعال میں وہ حدت ہو کہ الفاظ لو دینے لگیں جب حراغاں کا عالم ہو جائے۔ یقینا مصنف مقامیت کے اظہار کے تجربے میں کامیاب ہوئے ہیں اپنی پہلی بات دہراتا ہوں کہ جس نے بنگال نہیں بھی دیکھا اس کو بھی ایسے لگتا ہے جیسے ناول کے پڑھنے کے عرصے تک وہ بنگال میں رہا ہے۔

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ فضل احمد کریم فضلی، خون جگر ہونے تک، (کراچی: دبستان (محدود) پاکستان، بار دوم، ۱۹۶۰ء)، ص ۱۰۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۹۳۔

۵۔ غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، (مترجم)، پاکستان معاشرہ اور ثقافت، مولف: سٹینلی میرن، (لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۳۔

۶۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، (کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء)، ص ۲۸۔

۷۔ فضل احمد کریم فضلی، خون جگر ہونے تک، ص. د: ج۔

۸۔ ایضاً، ص: ر۔

۹۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، ''اردو زبان کی لسانی مفاہمت''، مشمولہ: اخبار اردو، جلد ۳۰، شمارہ ۴، مدیر: سید سردار احمد پیرزادہ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۷۔